خطبات متعلق کارنامہ حسین و مجاہدۂ کربلا

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

پیش لفظ

از قلم پروفیسر سید احتشام حسین رضوی ماہلی، الہ آباد

کسی کتاب کے پیش لفظ یا تعارف کا معذرت کے الفاظ سے شروع کرنا شاید بہت مناسب نہ ہو لیکن کم سے کم اس موقع پر اس کا اظہار ضروری ہے کیونکہ مقدمہ نگار کو موضوع کی عظمت اور مصنف کی اعلیٰ علمی اور دینی شخصیت کا احساس اس شدت سے ہے کہ یہ دونوں باتیں اس کی جنبش قلم کے لئے زنجیر کا کام کرتی ہیں لیکن امتثال امر کے پردے میں عزت افزائی کا خیال اس معذوری پر غالب آنے کی جرأت بھی پیدا کررہا ہے۔ ایک بات اور جو کم سوادی کے باوجود اظہار خیال میں معین ہے، وہ سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب کی تحریروں کا وہ پُرشوق مطالعہ ہے جس کا سلسلہ پچیس چھبیس برس سے قائم ہے۔ انھیں وجوہ سے یہ چند سطریں پیش لفظ کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ پھر بھی اتنا عرض کردینا ضروری ہے کہ اس پیش لفظ کو اس نظر سے نہیں پڑھنا چاہئے کہ اس سے کتاب کی معنویت یا قدروقیمت میں کوئی اضافہ ہوگا بلکہ چند ایسے اشارے کردینا مطلوب ہے جس سے مطالعہ کرنے والوں کی نظر موضوع کے پیچ در پیچ خارجی اور داخلی عوامل تک جاسکے اور اس بات کا احساس ہوسکے کہ مصنف نے کس خوبی سے انھیں اجاگر کیا ہے۔

زیر نظر کتاب جناب سید العلماء کے چودہ ایسے خطبات کا مجموعہ ہے جن کا موضوع واقعہ کربلا اور کارنامۂ حسینی ہے۔ یہ موضوع نیا نہیں ہے، خود مصنف علام نے اس کے مختلف پہلوؤں پر سیکڑوں صفحات لکھے ہیں اور لاتعداد تقریروں میں اس مجاہدۂ عظیم کے اسرار و نکات بیان کئے ہیں لیکن تاریخ کے دامن پر وقت کی یہ ایسی خونابہ افشانی ہے جو انسانی ذہن کو برابر متوجہ اور متحرک کرتی رہتی ہے، اس پر جذبات حیرت اور دردمندی کو مسلسل اکساتی رہتی ہے کہ وہ تیرہ صدیوں تک اس تازہ رہ جانے والے خون کی نوعیت معلوم کرے۔ ہر دور کے مورخ، شاعر، مفکر اور خطیب اپنے شعور، ادراک، جذبات اور مصالح کے مطابق اس واقعۂ ہائلہ کے متعلق اظہار خیال کرتے رہے ہیں اس لئے اس کی تعبیریں اتنی مختلف رہی ہیں۔ زمان ومکان کی پہنائی میں چھوٹے بڑے واقعات اور تصورات ایک دوسرے سے ٹکراتے اور زنجیر کے حلقوں کی طرح ایک دوسرے میں جڑتے چلے جاتے ہیں، حالات اور واقعات اسباب وعلل سے وجود میں آتے ہیں اور پھر خود نئے اور کبھی کبھی دوررس نتائج کا سبب بن جاتے ہیں۔ مورّخانہ صداقت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سبب اور نتیجے کے ان رشتوں کا پتہ لگائے اور بے کم وکاست ان کو جوڑ کر پیش کردے۔ لیکن مورخ بھی

انسان ہوتا ہے، اپنے عقائد، تعصّبات، ادراکِ حقیقت پر عقلی اور جذباتی ذرائع، طرزِ فکر اور مصالح رکھتا ہے اس لئے وہ واقعات کو جس طرح پیش کرتا ہے، ضروری نہیں کہ کوئی دوسرا شخص اسے اسی صورت میں تسلیم کرلے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر تاریخی واقعہ کی تعبیر میں تحقیق و تفتیش اور ردّ و قبول کی مختلف منزلیں آتی ہیں اور تاریخ میں ان منزلوں کے تعیّن کے سلسلہ میں مختلف مدارج قائم ہوجاتے ہیں۔ پھر انھیں منقولات کے گرد و پیش معقولات اور جذبات کے دائرے بن جاتے ہیں جو قوی تر محرک ثابت ہوتے ہیں۔

تاریخ اسلام کی ایک خاص منزل پر حادثۂ کربلا وقوع پذیر ہوا۔ مورّخوں اور مصنفوں نے اپنی بصیرت، واقفیت اور اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اس کا ذکر کیا۔ جن ادوار اور جن تاریخی حالات میں یہ کتابیں لکھی گئیں ان میں بے لاگ تاریخ ایسی ممکن ہی نہ تھی اس لئے کہیں اسباب و علل کی بحث غیر منطقی ہے اور کہیں اخذ نتائج کا طریقہ گمراہ کُن۔ تاہم انھیں کے تنقیدی مطالعہ سے واقعات کی کڑیاں اس طرح جڑ جاتی ہیں کہ اس ابتلائے عظیم کا بہت سا حصہ اپنے اسباب اور نتائج کے ساتھ سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اسباب کے سمجھنے اور ان سے نتائج نکالنے کی ذمہ داری مورخ کی ہوتی ہے، ضروری نہیں کہ اس کا مطالعہ حقائق کے اصل اسباب اور واقعات کی بنیادی تہہ تک پہنچ جائے اور ان اسرار و رموز کے بھید کھول دے جو عقیدے کی نگاہ میں بھی حقیقی کہے جاسکتے ہیں۔

مثلاً جب کوئی لکھنے والا یہ کہتا ہے کہ امام حسینؑ نے ایسا اس لئے کہا یا کیا کہ............تو حقیقتاً اس کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والے پر ہوتی ہے، وہ امام حسینؑ کے قول اور عمل کو اپنے علم کے آئینے میں دیکھتا اور اپنی محدود بصیرت کے مطابق اس کی تشریح کرتا ہے۔ اسے یہ کہنے یا سمجھنے کا حق نہیں ہے کہ وہ جو کچھ سمجھ رہا ہے وہی یقینی اور قطعی ہے جب تک کہ ایسا کہنے کے لئے اس کے پاس وافر مواد موجود نہ ہو۔ تاریخی واقعات نے جو مواد ہمارے لئے فراہم کئے ہیں ان کے تجزیہ یا ان کی چھان بین کے لئے بہت سے دوسرے علوم کی ضرورت بھی ہوتی ہے مثلاً عمرانیات، نفسیات، فلسفہ، جغرافیہ، سیاسیات، قانون، منطق، معاشیات، تاریخ مذاہب، فلسفۂ مذاہب وغیرہ کی مدد سے حالات اور واقعات پر گہری نظر ڈالی جاسکتی ہے، اور جب واقعہ کربلا جیسا موضوع پیش نظر ہو تو اس میں قرآنی علوم، احادیث، فقہ اور ابتدائی تاریخ اسلام کے تفصیلی مطالعہ کو بھی شامل کرلینا چاہئے۔ ہوسکتا ہے کہ ان تمام علوم اور حقائق پر نظر رکھنے کے بعد بھی نتائج بالکل صحیح نہ نکلیں لیکن پھر ایک بڑے سے بڑے عالم اور مبصّر کے بس میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ وہ اپنے نتائج ٹھوس علمی اور منطقی بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے ان تمام علوم اور حقائق کا جائزہ لے جن تک اس کی دسترس ہے۔

مولانا علی نقی صاحب کے یہ خطبات پڑھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کارنامۂ حسینی کو علوم کے اسی وسیع آئینے میں دیکھا ہے تاکہ اس کی آفاقیت اور ہمہ گیری زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوسکے اور اس کے وہ پہلو بھی پیش نگاہ ہوجائیں جن پر عام طور سے توجہ نہیں کی جاتی۔ اس طریق کار میں اگر کوئی خطرہ ہوسکتا ہے تو یہی کہ تعبیرات کے ہجوم میں واقعہ کی اصل روح دب نہ جائے لیکن اس کا امکان اسی وقت ہوسکتا ہے جب حالات پر بالکل غیر شخصی اور غیر جذباتی نظر ڈالی جائے۔ یہاں یہ صورت نہیں ہے بلکہ جس شخص نے بھی ان خطبات کو سنا ہے، یا اس کی چند سطریں پڑھنے کی زحمت کرے گا اسے لکھنے والے

کے عقیدہ کی آنچ اور جذبات کی گرمی کا احساس ہوگا۔ مولانا موصوف کی تمام تحریریں علم اور عقیدے کے اسی امتزاج سے ترتیب پاتی ہیں جس کی وجہ سے تاریخ کے انسانی پہلو واقعات کی معروضیت کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ واقعۂ کربلا کی عظمت اور گوناگونی ہر طرح کے لکھنے والے کو اظہار کے متنوع طریقے فراہم کردیتی ہے۔ شاعر ہو یا خطیب، معلم اخلاق ہو یا فلسفی، دین دار ہو یا بے دین ہر ایک اپنے ظرف کے مطابق اس سرچشمۂ فکر وعمل سے سیراب ہولیتا ہے کیونکہ بہ ظاہر جو واقعہ چند دنوں میں یا چند گھنٹوں میں مل گیا اس کی جڑیں نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ فکر انسانی میں بہت دور تک پیوست ہیں۔ اس پر غور کی نگاہ ڈالتے ہی ماضی کے چہرے سے نقاب ہٹنے لگتی ہے اور ذہن ساری تاریخ انسانی میں اعلیٰ کردار اور عمل کی تقابلی تصویریں ڈھونڈھنے لگتا ہے۔ امام حسینؑ نے اصول اسلام اور سنت رسولؐ وعلیؑ پر اس طرح عمل کیا کہ ان کے تسلسل میں ایک قسم کا تخلیقی حسن اور تعمیری جوہر نمایاں ہوگیا، وہ قوانین اخلاق جنھیں لوگ مردہ اور ناقابل عمل سمجھ رہے تھے زندہ ہوگئے اور ایثار وقربانی کے وہ مرقعے سنور گئے جن سے انسانیت کا نام روشن ہوتا ہے۔ مولانا سید علی نقی صاحب نے واقعہ کربلا کی عظمت اور کردار حسینؑ کے جلال وجمال کو کسی وقت بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا ہے۔ یہ مختصر خطبات بڑے بلیغ انداز میں ان پہلوؤں کی طرف اشارے کرتے اور موضوع کی وسعت سے روشناس کردیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ موصوف کی دوسری تصانیف کی طرح یہ کتاب بھی توجہ سے پڑھی جائے گی کیونکہ توجہ ہی سے پڑھے جانے پر اس کے جوہر کھلیں گے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے جملوں، فقروں اور بعض اوقات لفظوں میں ایسی پُرکاری اور معنی خیزی ہے کہ سرسری مطالعہ کرنے والے اس کے لفظی محاسن اور معنوی دقائق دونوں سے محروم رہ جائیں گے۔

مقصد حسین علیہ السلام

(وہ تقریر جو شب ہفتم محرم ۱۳۶۰ھ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے نشر ہوئی)

پھولوں کی سیج پر آرام کی نیند سونا آسان ہے مگر کانٹوں پر بستر لگائے رکھنا مشکل۔ خوشی کو ہر ایک کی طبیعت ڈھونڈھتی ہے مگر غم کے ساتھ نباہ بہت دشوار۔ ہاتھ میں لگی ہوئی پھانس تو جب تک نکل نہ لے چین نہیں آتا۔ پھر دل میں چبھے ہوئے کانٹے کو سینہ سے لگائے رکھنا کہاں ممکن ہے۔ اسی سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کربلا کا واقعہ بس ایک درد بھری کہانی نہیں تھا بلکہ اس میں انسانی زندگی کے جراثیم مضمر تھے جب ہی انسانوں کی دنیا میں اس کا چرچا ہوتا رہا اور پھیلتا رہا۔

اس وقت جب کہ ہم حسینؑ کے مقصد کو سمجھنے اور سمجھانے کھڑے ہوئے ہیں دنیا کے بہت سے حصوں میں حسینؑ کا غم منایا جارہا ہے اور ۶۱ھ میں کربلا کی سرزمین پر جو قربانی دی گئی ہے اسے آج بارہ سو نانوے برس ہوچکے ہیں اور ایک برس کے بعد ۱۳۶۱ھ کا محرم آئے گا جس میں پورے تیرہ سو برس ہوجائیں گے اور اس لئے اس موقع پر دنیا کے اکثر حصوں میں ایک بہت بڑی یادگار منانے کا انتظام ہورہا ہے۔

اس تیرہ سو برس کی لمبی مدت میں زمانہ نے کتنی کروٹیں لیں۔ آندھیاں چلیں اور نکل گئیں، سیلاب آئے اور گزر گئے مگر حسینؑ کی یاد زندہ رہی اور آج بھی زندہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسینؑ کے نام اور ان کے کام نے نوع انسانی کے دل میں گھر کرلیا ہے۔ لب پر حسینؑ کا نام، دل میں حسینؑ کی یاد اور دماغ

کو حسینی مقصد کی تلاش ہے۔ شخصی اور ذاتی مقصد نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کسی کو کیا پڑی تھی کہ زندگی اس کی یاد میں صرف کرے۔ کسی مصیبت کے ستائے کو دیکھ کر نگاہ مڑ جانا یا دل میں ہمدردی سے کسک پیدا ہونا بالکل ایک وقتی چیز ہے مگر اسے کوئی مستقل حیثیت نہیں مل سکتی حسینؑ کا مقصد نوع انسانی سے وابستہ تھا اور اجتماعی حیثیت رکھتا تھا اس لئے انسانیت نے اپنا دل چیر کر اس کی یاد کو محفوظ کرلیا۔

اب آپ چاہتے ہوں گے کہ میں اس مقصد کو کھلے لفظوں میں بیان کردوں۔ اچھا سنیئے! مگر آپ کو میرے ساتھ تھوڑی دور تک چلنا پڑے گا۔

آپ کو یہ تو معلوم ہوگا کہ حضرت محمد مصطفیؐ نے تمدن اور معاشرت اور آئین زندگی میں ایک انقلاب کا پیغام پہنچایا جس کا نام تھا اسلام۔ اسلام نے زندگی کے ہر حصہ میں بہت اہم تبدیلیاں کیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نوع انسانی کو برادری اور برابری کا سبق پڑھایا۔ وہ حدود وامتیازات جو انسانوں میں قائم ہوگئے تھے جن سے خدا کی مخلوق اونچے اور نیچے کے دو درجوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ ان تمام امتیازات پر اسلام نے قلم پھیر دیا اور تمام آدمیوں کو ایک اکیلے خدا کی پرستش کی دعوت دی۔

کون نہیں جانتا کہ دنیا میں ''طاقت حق ہے'' کا کلمہ ہمیشہ پڑھا گیا اور انتہا ہے کہ آج جب کہ دنیا تمدن اور تہذیب میں بڑے اونچے درجہ پر بتلائی جاتی ہے۔ آج بھی طاقت ہی کا بول بالا ہو رہا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ نوع انسانی کے پرخچے اُڑ رہے ہیں اور انسانیت کے دامن کی دھجیاں ہوا میں تتر بتر دکھائی دیتی ہیں۔

عرب میں شعوبیت یعنی قوم ونسل کے امتیاز کا خیال بڑا غالب تھا۔ وہ اپنے سامنے غیر عرب کو انتہائی ذلیل سمجھتے تھے اور خود آپس میں قانونی احکام اور فوجداری کے قوانین وتعزیرات تک میں بڑے اور چھوٹے کا فرق قائم کرلیا تھا۔ بڑے آدمیوں کی جانیں بہت مہنگی تھیں اور چھوٹے آدمیوں کی سستی جانیں تول میں ان کے برابر نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ ان میں مال ودولت، قوم وقبیلہ کی کثرت خاندانی جاہ وحشمت وہ چیزیں تھیں جو عزت کا معیار سمجھ لی گئی تھیں اور جو لوگ ان چیزوں سے محروم تھے ان کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔

یہ طاقت کی پوجا ہزاروں طرح کے اجتماعی گناہوں کی نیو تھی اور بہت سی خرابیوں کے سوتے اسی ایک سرچشمہ سے پھوٹ رہے تھے۔

حضرت محمد مصطفیؐ نے آکر پہلی ہی دفعہ ان حدود اور امتیازات کو ختم کیا اور بڑائی کا ایک نیا تصور دنیا کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ آدمی سب ایک ہیں، فرق ہے تو انسانی فرائض کے ادا کرنے کے ساتھ، جو ان فرائض کو سب سے زیادہ ادا کرتا ہے وہی سب سے بڑا آدمی ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس سے تمام ان لوگوں کے اقتدار کو کاری ضرب لگی جو عزت واقتدار کے بٹوارے میں پہلے کافی حصہ رکھتے تھے۔ انھوں نے ڈٹ کر اسلام کا مقابلہ کیا اور پیغمبرؐ کو ان کے ہاتھوں بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔ اس سلسلہ میں بدر، احد اور خندق کی لڑائیاں مشہور ہیں اور یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ان لڑائیوں میں رسولؐ کے مقابلہ میں قبیلۂ بنی امیہ کا لیڈر ابوسفیان آگے آگے تھا۔ پیغمبرؐ کو فتح ہوئی اور یہ لوگ ناکام ہوئے آخر میں ان کو ہتھیار ڈال دینا پڑے اور حضرت محمد مصطفیؐ کے سامنے سر جھکا دینا پڑا۔

پیغمبرؐ کے زمانہ میں کسی کو یہ موقع نہیں مل سکتا تھا کہ وہ اسلام کے اصول میں کوئی تبدیلی کر سکے۔ آپ اپنے مشن کے بڑی سختی کے ساتھ خود پابند بھی تھے اور دوسروں کو پابند بناتے بھی تھے۔ اس وقت جب عرب کے تمام قبیلوں کی طرف سے روپیہ کھنچ کھنچ کر آپ کے پاس آتا تھا اور ہزاروں آدمی آپ کا حکم ماننا اپنا فخر سمجھتے تھے اس وقت بھی آپ نے فقیروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، پھٹے پرانے کپڑے پہننا اور ملنے والوں سے برابری کا برتاؤ کرنا نہیں چھوڑا آپ نے اپنی مسجد کا مؤذن ایک حبشی کو بنایا تھا جسے عرب لوگ بہت ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے مگر رسولؐ نے اس کو بڑی عزت دے رکھی تھی۔ آپ نے اپنی پھوپھی زاد بہن کی شادی ایک آزاد کئے ہوئے غلام کے ساتھ کردی، پھر ایک وقت ایسا آیا کہ آپ نے اسی غلام کے لڑکے کو بڑے اونچے خاندان والے عربوں کا سردار بنا دیا، اس پر لوگ بہت جز بز ہوئے مگر آپ نے ایک نہ سنی اور اپنی بات پر قائم رہے جن لوگوں کی آپ بڑی تعریف کرتے تھے اور انتہائی عزت کرتے تھے بہت سے ان میں سے غریب، کمزور اور پردیسی لوگ تھے۔ سلمان فارسی جو ایران کے رہنے والے تھے رسولؐ کے ساتھ اتنی خصوصیت رکھتے تھے جو کسی دوسرے کو مشکل سے حاصل تھی۔ یہ سب اس لئے تھا کہ ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہو اور انسانیت سونے چاندی کے گنگا جمنی طوق اور زنجیروں کی قید سے آزاد ہو۔

افسوس کہ پیغمبرؐ کی زندگی نے زیادہ ساتھ نہیں دیا اور آپ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ آپ کا مشن اس حیثیت سے مکمل ہوگیا تھا کہ آپ نے اس کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کردیا اور کچھ لوگ عملی طور سے اس کے پابند ہوگئے مگر آپ کو معلوم ہے کہ جمہور کی ذہنیت کی تبدیلی اور اس تبدیلی کے راسخ ہونے کے لئے بڑی مدت درکار ہوتی ہے۔

رسولؐ کے بعد ابھی تھوڑے دن گزرے تھے کہ بنی امیہ کے اقتدار کی بنیاد قائم ہوئی۔ یہ شروع شروع صرف ایک صوبہ کے گورنر کی حیثیت سے تھی مگر رفتہ رفتہ اس کے اثر اور نفوذ میں ترقی ہوتی گئی۔

شام میں اس خاندان کا اقتدار بالواسطہ اس جماعت کا اقتدار تھا جو ہمیشہ پیغمبر اسلامؐ سے لڑتی رہی تھی اور آخر میں بے بسی سے سر اطاعت جھکانے پر مجبور ہوئی تھی۔

اس کا فیصلہ ہر شخص کر سکتا ہے کہ اس جماعت کے منصوبے اپنے برسر اقتدار آنے کے بعد کیا ہونے چاہئیں؟ معمولی دل و دماغ بھی کہے گا کہ ان ہی امتیازات کو واپس لانا جنھیں پیغمبر اسلامؐ نے مٹادیا تھا اور جن کا اثر اس جماعت کے اقتدار پر بہت گہرا پڑا تھا۔ مگر چونکہ اس جماعت کا اقتدار اب اسلام کے سایہ میں اسلام کی نمائندگی میں حاصل ہوا تھا اس لئے ضرورت تھی کہ یہ اس پردہ ہی میں اپنے منصوبوں کی تکمیل کریں اور یہ اس سے زیادہ خطرناک تھا کہ کھل کر ایک دشمن کی حیثیت سے اپنے مقاصد کا اعلان کر دیتے۔

سمجھنے والوں نے سمجھا کہ اسلام کی سادگی اور اسلام کی مساوات کے بجائے ملوکیت اور جہانبانی کی شان پیدا ہو رہی ہے اور سرمایہ داری کی بنیاد پڑ رہی ہے، اس پر احتجاج بھی ہوا اور احتجاج کا نتیجہ تھا ابوذر غفاریؓ کا جلاوطن کیا جانا، زبدہ کے جنگل میں بھیجا جانا اور رسولؐ کے اس صحابی کا اکیلے دم توڑنا اور دنیا سے گزر جانا۔ یہ ابتدا ہے اس جنگ کی جس کی تکمیل کربلا میں ہوئی۔

زمانہ نے ایک کروٹ ایسی بدلی کہ اسلام کی شہنشاہی حضرت علیؑ کو حاصل ہوئی آپ کو سیاسی اقتدار حاصل ہونا اس

سادگی اور مساوات کے اصول کی نئے سرے سے عملداری ہوجاتا تھی جو رسول اسلامؐ نے قائم کیا تھا، اسی لئے مخالف جماعت نے بغاوت کی اور تابڑتوڑ کی شورشوں اور لڑائیوں میں آپ کو ایسا اُلجھایا گیا کہ آپ ان مقاصد کو پورا نہ کرسکے جو آپ کے سامنے تھے۔ آخر مسجد میں علیؑ کا سر تلوار سے دو ٹکڑے ہوگیا اور اسلامی مساوات کا وہ مشنری دنیا سے رخصت ہوگیا۔

آپ کے بیٹے حضرت حسنؑ کو زمانہ وہ ملا جب شام کی حکومت کو بڑی قوت حاصل ہوچکی تھی، آپ نے جنگ کے ذریعہ سے کامیابی کی کوئی صورت نہ پائی تو صلح کر کے مخالف کی جارحانہ کاروائیوں کو اصول کے شکنجہ میں قید کیا اور آپ نے اپنی دور اندیشی سے کام لے کر یہ بڑی شرط رکھ دی کہ شام کے حاکم کو اپنے بعد کسی کے جانشین بنانے کا حق نہ ہوگا بلکہ اس کے بعد حکومت بنی ہاشم کی طرف واپس آئے گی۔ یہ ایسی شرط تھی جس نے مستقبل کو کسی حد تک محفوظ کردیا تھا مگر سیاست کی دنیا میں سچائی اور وعدہ کی پابندی تو کوئی چیز ہے نہیں۔ وعدے کئے جاتے ہیں توڑنے کے لئے اور معاہدے لکھے جاتے ہیں ردی کی ٹوکری میں پھینکنے کے لئے۔ وہی ہوا جو اس طرح کی سیاست کا تقاضا تھا۔ شرطیں کیسی اور کہاں کا معاہدہ۔ حضرت امام حسنؑ کی زندگی آخری مقاصد میں رکاوٹ پیدا کررہی تھی۔ آپ کو پراسرار طریقہ پر زہر سے شہید کردیا گیا۔ یہ بھی ایک قربانی تھی جو اسلامی تمدن کی قربان گاہ پر نذر ہوگئی۔

اب ان لوگوں میں جو اسلامی تمدن کے محافظ ہوسکتے تھے صرف حسینؑ کی ذات باقی تھی۔ ظاہری طور پر اب آپ کو قدم آگے بڑھانے کا کوئی موقع نہ تھا۔ وہ پورا جتھا جس کو ساتھ لے کر شام کی طاقت سے مقابلہ کیا جاسکتا تھا امام حسنؑ کی صلح کے بعد بکھر چکا تھا اور اب اس کے اکٹھا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ سیاست حاضرہ کی غیر اسلامی چال دیکھ کر دم گھٹتا تھا مگر آپ منتظر تھے کہ معاویہ اپنے بعد کے لئے کیا صورت اختیار کرتے ہیں۔

نہ سمجھنا چاہئے کہ اس مدت میں حق کے پجاری بالکل چپ رہے۔ نہیں اس سخت اندھیری رات اور اس کے سناٹے میں کبھی کبھی ادھر ادھر سے چیخ کی آواز سنائی دے جاتی تھی مگر وہ آواز اسی طرح دبادی جاتی تھی جس طرح آپ سنتے ہیں کہ ہٹلر اپنے ملک میں ہر مخالف آواز کو دبادیتا ہے۔ عمرو بن الحق الخزاعی اور حجر بن عدی اور ان کے دس گیارہ ساتھیوں کا انجام تاریخ میں آپ کے سامنے ہے۔ یاد رکھئے کہ ان لوگوں کو حاکم شام سے کوئی خاندانی عداوت نہ تھی۔ وہ صرف اصول کا اختلاف تھا جس نے کائنات کی اس وسیع فضا میں ان کے لئے جگہ باقی نہ رکھی۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان واقعات پر احتجاج ضرور کیا مگر پھر بھی آپ دیکھ رہے تھے کہ آخری شرط کا کیا انجام ہوتا ہے؟

لیجئے آگیا وہ وقت کہ امیر معاویہ نے اپنے بعد کے لئے اپنے بیٹے یزید کو جانشین بنادیا۔ یہ اس مفاد کی آخری پامالی تھی جسے معاہدہ کے شرائط میں محفوظ کیا گیا تھا۔

یزید کے افعال بھی ایسے تھے جو اسلام کے احکام سے کھلم کھلا بغاوت کے مرادف تھے۔ امام حسینؑ نے اس کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔

معاویہ بھی سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں سب سے زیادہ متعلق ہستی حسینؑ کی ہے۔ اس لئے انھوں نے کوشش کی کہ آپ کو ملا لیا جائے مگر یہ کوشش ناکامیاب ہوئی۔ امام حسینؑ نے صاف کہہ دیا کہ میں اس کارروائی سے اتفاق نہیں کرسکتا۔ امیر معاویہ نے آپ کے ساتھ اس انکار پر زیادہ سختی نہیں کی مگر

معاویہ کا انتقال ہو گیا اور یزید تخت حکومت پر بیٹھا تو اس کے سامنے سب سے پہلے یہی مسئلہ تھا کہ حسینؑ سے بیعت حاصل کی جائے۔ اس نے مدینہ کے گورنر کو لکھا کہ حسینؑ سے بیعت لو نہیں تو ان کو قتل کرو۔ یہ پہلا ہی تشدد کا قدم تھا جو حسینؑ کے خلاف اٹھایا۔ حسینؑ اس کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ انھوں نے کہا کہ میری جان جائے مجھے گوارا ہے مگر میں اس سلطنت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کروں گا۔

وقت وہ تھا جب احساسات بالکل مر چکے تھے۔ فضا میں کامل سناٹا تھا۔ جن لوگوں سے مخالفت کا اندیشہ ہو سکتا تھا ان میں کچھ کا گلا گھونٹا جا چکا تھا اور کچھ کے ضمیر خرید کر ان کی زبانوں کو بند کر دیا گیا تھا۔ سنہری تلوار کی جھنکار اور روپیہ اشرفی کی کھنک نے بڑے بڑوں کے دل ڈانوا ڈول کر دیئے تھے۔ اس وقت حسینؑ اس آخری اقدام کے لئے تیار ہو رہے تھے جو بنی امیہ کے استبداد کے قصر کو زمین پر گرا دے۔

امام حسینؑ کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرتے۔ انھوں نے جنگ کا ایک نیا طریقہ نکالا جو ان سے پہلے دنیا نے نہیں دیکھا تھا۔ وہی ان کے مقصد کے لئے زیادہ مفید اور کارگر بھی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے ہیں۔ ان میں ذہنی جمود پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے احساسات پر غشی چھا گئی ہے۔ ان میں یہ شعور باقی نہیں رہا کہ بنی امیہ کے افعال واعمال اسلامی طریقہ کے خلاف ہیں۔

بڑا سبب اس کا اسلام کے نام کی وہ نقاب ہے جو ان کے چہروں پر پڑی ہوئی ہے۔ حسینؑ چاہتے تھے ایک ایسا شدید چھینٹا دیں کہ ان کے احساسات پھریری لے کر ہوش میں آ جائیں۔ اور چہرہ کی یہ نقاب ہٹ جائے۔ اس کے اصلی خط وخال سامنے آ جائیں اور دنیا دیکھ لے کہ اس ملوکانہ سیاست کے انتہائی قدم کہاں تک جا سکتے ہیں۔

انھوں نے اس کے لئے فوج اور لشکر جمع نہیں کیا۔ انھوں نے وہ عابد وزاہد اور متقی لوگ ڈھونڈھے جن میں کا ہر شخص اپنے اخلاق واوصاف کی بلندی سے سچے اسلام کا نمائندہ تھا اور ملک میں جس کے زہد اور پارسائی کا ہر شخص کو اعتراف تھا۔ انھوں نے رسولؐ کے خاندان کے جوان اور بچے یہاں تک کہ دودھ پیتا بچہ تک اپنے ساتھ لے لیا اور رسولؐ کے گھرانے کی معزز عورتیں جن میں خاص رسولؐ اللہ کی حقیقی نواسیاں موجود تھیں اپنے ہمراہ لیں۔ حسینؑ نے اپنے دشمن کی فطرت کو خوب پہچان لیا تھا۔ وہ اس کے تشدد کے امکانات میں اضافہ کر رہے تھے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ حسینؑ نے جو سامان اپنے ساتھ لیا تھا وہ سب حسینی مقصد کی تکمیل میں صرف ہوا۔

بوڑھے قتل ہو گئے۔ جوان قتل ہو گئے بچے قتل ہو گئے۔ دشمن کے تشدد کا آخری تیر باقی تھا۔ حسینؑ نے اس کے لئے نشانہ ڈھونڈھ دیا۔ رباب کی گود سے چھ مہینہ کا بچہ لے لیا۔ سب سے آخر میں اپنی گردن کو بھی پیش کر دیا۔ شاہزادیوں کو قید ہونے کے لئے اپنے بعد چھوڑا۔

یہ سب ہوا اور سمجھ بوجھ کر ہوا۔ حسینؑ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں اور یزیدیت اور اسلام دو الگ الگ چیزیں ہو گئیں۔ حسینؑ کا مقصد بھی بس یہی تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلامی تمدن پر جو اموی شہنشاہیت کا رنگ چڑھ رہا ہے جس سے اس کے حدود وامتیازات مٹتے جاتے ہیں، یہ رنگ اُتر جائے۔ دنیا یہ سمجھ لے کہ اسلامی تمدن وہ نہیں ہے جو دمشق کے دارالامارہ میں نظر آتا ہے جہاں شراب کے جام چل رہے ہیں اور مہوشوں کا جھرمٹ لگا ہے۔ جہاں

تمام رعایا سے لے کر دولت سمیٹی جاتی ہے اور وہ خلیفہ کی رنگ رلیوں پر صرف ہوتی ہے۔ جہاں طرب ونشاط کے نقار خانہ میں غریبوں کی صدا سنی نہیں جاتی اور جہاں انصاف کو کند چھری سے حلال کیا جاتا ہے۔ حسینؑ نے دکھلایا کہ اسلام کا تمدن وہ ہے جسے کربلا کے میدان میں پیش کر دیا گیا، جہاں ایک حبشی غلام بھی زخمی ہو کر گھوڑے سے گرتا ہے اور امام کو آواز دیتا ہے تو امام اس کے سرہانے جاتے ہیں اور سر اُٹھا کر گود میں رکھتے ہیں۔ غلام کی روح آقا کی گود میں جسم سے مفارقت کرتی ہے۔

یزیدی طاقتیں دنیا میں بہت پیدا ہو سکتی ہیں اور ہر قوم میں پیدا ہوتی ہیں، مگر حسینی مشن جو کربلا کی زمین پر پایۂ تکمیل کو پہنچا وہ ہر زمانہ میں یزیدیت کی شکست کے لئے کافی ہے، اس شرط سے کہ حسینؑ کے کارنامہ کو دنیا یاد رکھے اور اس سے سبق حاصل کرے۔

❁❁❁

پیام

ڈاکٹر سید رضا حسین رمزؔ، سفینہ اپارٹمنٹ، لکھنؤ

اگر ہے دل میں خدا کی الفت　　تو خوف ہوگا نہ کوئی حسرت
ہے آل احمدؐ کی دل میں الفت　　تو سچ میں مل کر رہے گی جنت
ہے شان اپنی یہ اپنی غربت　　انھیں مبارک ہو ان کی ثروت
میں مانتا ہوں خدا کی وحدت　　مجھے نہ ہوگی لحد میں وحشت
جو ہاتھ آئے علوم دینی　　تو ہیچ ہے کل جہاں کی دولت
سکون قسمت میں ہے اسی کے　　بھلائی کرنا ہے جس کی فطرت
ضرور آئے گا ایک دن جب　　جھکے گی سجدے میں ساری خلقت
اگر ہو انساں، ہو بھائی بھائی　　دلوں میں رکھتے ہو کیوں کدورت
خدا سے ہے رمزؔ لو لگائے　　اسی کا وہ ہے اسی کی خلقت

اسپیشل جوڈیشیل مجسٹریٹ نے عہدہ سنبھالا

ہائی کورٹ الٰہ آباد نے سید حسن حیدر رضوی سفیرؔ اعظمی ریٹائرڈ سب رجسٹرار کا تقرر بحیثیت اسپیشل جوڈیشیل مجسٹریٹ سول کورٹ فیض آباد میں کیا ہے۔ موصوف نے ضلع جج کے حکم کے مطابق اپنا عہدہ ۸؍جولائی ۲۰۰۸ء کو بحیثیت اسپیشل جوڈیشیل مجسٹریٹ سنبھال لیا ہے۔